رسائل و مسائل

کعبے میں برہمن

سوال :- بندہ کو پچھلے برس حرمین شریفین کی زیارت نصیب ہوئی اور پچھلے ماہ دس تاریخ کو وہاں سے واپس لوٹا۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں ابن سعود کی برہمنی طرز کی حکومت اور مجاورانہ نظام کے باعث جو خباثتیں اور دور از شریعت رسوم جاری ہو چکی ہیں وہ ایک مسلمان کے لیے ناقابلِ برداشت اور ناقابلِ بیان ہیں۔ میں اس وقت بیت اللہ کے داخلے اور حجرِ اسود کو بوسہ دینے کے لیے رشوت ستانی، مکہ مکرمہ کے پنڈتوں اور برہمنوں کا حجاج کو لوٹنا، سعودی حکومت کی طرف سے حاجیوں کی لوٹ کھسوٹ اور سب سے بڑھ کر طوافِ بیت اللہ کرتے وقت نوجوان مطوفوں کی جنسیت زدہ حرکات (عورتوں کے لیے بھی مرد ہی مطوف ہوتے ہیں)، اہل مکہ کی بداخلاقی اور حجاج کے ساتھ ذلیل و ناروا سلوک و دیگر پست کیفیتوں کا ذکر نہیں کروں گا۔ بلکہ ایک ذاتی فعل درج کر رہا ہوں اور رہنمائی کا طالب ہوں۔

وہاں کے واقعات دیکھ کر میں اتنا دل برداشتہ ہوا کہ نعوذ باللہ یہ سمجھنے لگا کہ ہندوؤں کے تیرتھ یاتراؤں اور سکھوں کے دربار صاحب کی طرح حج بھی ایک میلہ ہے[1]

[1] سائل اگر توجہ فرمائیں تو نماز کا حال بھی ایسا ہی نظر آئے گا۔ کتنے ہی ائمہ مساجد ہیں کہ جن کے پیچھے نماز پڑھنے سے سارا حضورِ قلب برباد ہو جاتا ہے۔ کتنے ہی خطیب ہیں جن کے خطبے سن کر اوسط درجے کے ذہین لوگوں کے دل نمازِ جمعہ سے اچاٹ ہو جاتے ہیں۔ کتنی ہی مسجد کمیٹیاں ہیں کہ جن کے حسنِ انتظام اور جن کے قواعد و ضوابط کی وجہ سے اللہ کی مسجدیں فریاد کرتی ہیں۔

؎ پنبہ کجا کجا نہم ! (ن۔ ص)

جو حجاج کو لوٹنے کے لیے منعقد کیا جاتا ہے۔ اور یہ اللہ، رسول، اسلام، دیگر مذاہب کی طرح فراڈ اور جعل ہے (اے اللہ! اس لغزش سے مجھے معاف کرنا!)۔ آخر دل کو ڈھارس دینے کے لیے گذشتہ تاریخ کو نگاہ میں رکھا اور اس خیال سے کہ اسی اللہ کے گھر میں تین سو ساٹھ بت رکھے گئے تھے، دل کو تسکین ہوئی کہ آج اس تہذیبی دور میں یہ تین سو ساٹھ بت نئی نئی صورتوں میں موجود ہیں۔ اس لیے اسلام سے متنفر ہونا غلط ہے۔ یہ ہماری اپنی بداعمالی اور غفلت کا نتیجہ ہے۔ اور اس کی وجہ دراصل اسلام کے صحیح تصور سے بُعد ہے۔ کثرت استغفار سے یہ وسوسہ دل سے خارج ہوا اور پھر بیت اللہ کے طواف سے کیف و سرور حاصل ہونے لگا۔ لیکن اہل عرب کی بداعمالی اور بداخلاقی نے مجھے ان سے متنفر ضرور کر دیا اور میں کسی اچھی شے کو عرب سے منسوب کرنا پسند نہ کرتا تھا۔ اور جب کبھی کسی عرب سے گفتگو ہوئی اور اس نے نبی اکرمؐ کے عربی ہونے پر فخر و ناز کیا تو اس سے میرے دل کو ہمیشہ چرکا لگا۔ اور نبی اکرم صلعم جیسی مقدس ہستی کو عرب جیسی ناپاک زمین سے منسوب کرنے سے دل نے روکا، اور ایک دن روضۂ اقدس پر سلام پڑھتے ہوئے جب رواجی اسلام کے ان فقروں پر پہنچا السلام علیک یا نبی المکی، یا نبی المدنی، یا نبی الحجازی، یا نبی العربی، یا نبی القرشی، یا نبی الہاشمی۔ تو خیال پیدا ہوا کہ نادانستہ طور پر اس طرح قومی اور وطنی تصور نبی صلعم کی ذات پاک سے وابستہ کر رہا ہوں۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم تو تمام جہانوں، قوموں اور وطنوں کے لیے تھے اور میں آپؐ کو ہاشمی، قرشی، مکی، مدنی اور عربی کے الفاظ سے محدود کر رہا ہوں۔ سلام کی کتاب سے میں نے ان فقروں کو کاٹ دیا اور نبی صلعم کو ان مقامی و محدود نسبتوں سے پکارنا چھوڑ دیا۔

آپ تحریر فرمائیں کہ ایسا کرنے سے میں گنہ گار تو نہیں ہوا، اگر ان الفاظ کو کاٹنا اور استعمال ترک کرنا گناہ ہے تو میں توبہ کروں۔

جواب: - آپ نے سفر حج کے جو حالات لکھے ہیں اور ان حالات کو دیکھ کر آپ پر جو اثر

پڑا ہے اسے معلوم کر کے سخت اذیت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اُن لوگوں سے سمجھے جنہوں نے "کتاب و سنت"، "کتاب و سنت" کے نعرے بلند کر کے حجاز پر قبضہ کیا تھا اور آج انہوں نے وہاں یہ حال کر رکھا ہے کہ اللہ کے جو بندے عقیدت بھرے دل لیے ہوئے مرکزِ اسلام کی طرف جاتے ہیں وہ وہاں سے یہ اثرات لے کے پلٹتے ہیں۔

حج کے متعلق جو وساوس آپ کے قلب میں پیدا ہوتے تھے، الحمدللہ کہ وہ تو آپ نے خود ہی دُور کر لیے اور اللہ سے معافی مانگ لی۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس لغزش کو معاف فرما دے گا۔ اب آپ اُس نفرت کو بھی دل سے نکال دیں جو آپ کے اندر عرب[1] اور اہلِ عرب کی طرف سے پیدا ہو گئی ہے۔ ہم کو عرب سے جو تعلق ہے وہ آج کے عربوں کی بدولت نہیں ہے بلکہ ان بندگانِ حق کی وجہ سے ہے جن کی قربانیوں اور جانفشانیوں سے دنیا کے گوشے گوشے تک نورِ اسلام پہنچا۔ ان کے احسانات کا یہ تقاضا ہے کہ ہم عرب اور عربیت سے محبت کریں۔ رہے آج کے عرب، تو یہ قابلِ نفرت نہیں، قابلِ رحم ہیں صدیوں تک شاہی حکومتوں نے ان کو جاہل رکھنے اور مادی و اخلاقی پستیوں میں دھکیلنے کی باقاعدہ کوشش کی ہے۔ اسی کی بدولت آج یہ اس حال کو پہنچے ہیں۔

---

[1] نبی کریم صلعم کی نبوت اگرچہ عالمگیر بھی ہے اور زمانی لحاظ سے قیامت تک کے لیے بھی ہے لیکن آپ کی ذات اقدس کو ملکی، قومی، نسلی اور زمانی نسبتوں کے ساتھ ذہن میں لانا اس وجہ سے ضروری ہے کہ جب انبیاءؑ کو بشری نسبتوں سے بالاتر کیا جانے لگتا ہے، تو بالآخر ان کو الوہیت کے مقام پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ پھر آخر اس تاریخی حقیقت کو آپ اپنی اور دوسروں کی نگاہوں سے کیسے چھپائیں گے کہ نبی صلعم ملک عرب کے شہر مکہ میں قریش کے ہاشمی خاندان کے ایک باپ عبداللہ اور ایک ماں آمنہ کے ہاں پیدا ہوئے، پھر ہجرت کر کے نکلے تو بقیہ عمر مدینہ میں گذاری۔ موجودہ عربوں کا حالِ زار تو ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ ہدایت کسی وطن اور نسل پر منحصر نہیں ہے بلکہ بسا اوقات، جو کسی داعیٔ ہدایت کے قریب ہوتے ہیں وہ دُور ہو جاتے ہیں اور جو دُور ہوتے ہیں وہ قریب بن جاتے ہیں۔ کیا خوب فرمایا عیسیٰ علیہ السلام نے کہ "کتنے ہی آگے ہیں جو پیچھے دھکیل دیے جائیں گے اور کتنے ہی پیچھے ہیں کہ جو آگے آ جائیں گے"۔ (ن۔ ص)

خدا ہماری مدد کرے کہ ہم خود بھی درست ہوں اور اُن اسلاف کی اولاد کو بھی ٹھیک کریں جو ہمارے محسن تھے!

پوتے کی محرومیٔ وراثت

سوال:- (۱) دادا کی زندگی میں اگر کسی کا باپ مرجائے تو پوتے کو وراثت میں سے کوئی حق نہیں پہنچتا۔ یہ مشہور شرعی مسئلہ ہے جس پر اس وقت حکومت کی طرف سے عمل ہو رہا ہے۔ اس بارے میں مختلف مسلک کیا ہیں اور آپ کس مسلک کو مزاج اسلامی سے قریب تر خیال فرماتے ہیں۔ اگر آپ کا مسلک بھی مذکورہ ہی ہے۔ تو اس الزام سے بچنے کی کیا صورت ہے کہ اسلامی نظام جو یتیم کی دستگیری کا اس قدر مدعی ہے، ایک یتیم کو محض اس لیے دادا کی وراثت سے محروم قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے باپ کو دادا کی وفات سے بعد تک زندہ نہ رکھ سکا۔

(۲) مال غنیمت میں لونڈیوں کی تقسیم کا مسئلہ۔

(ا) لونڈیوں کے بارے میں حکم جاری ہے۔ یا منسوخ ہو چکا ہے؟

(ب) لونڈیوں کی تقسیم کے لیے اگر معاشرتی ضروریات متقاضی تھیں تو کیا اُس کا دوسرا حل ممکن نہ تھا؟

(ج) لونڈیاں صرف اُن عورتوں کو بنایا جاتا تھا جو مسلمانوں کے لیے مردوں کے شانہ بشانہ لڑنے کے لیے آتی تھیں یا گھر میں بیٹھی ہوئی عورتوں کو بھی لاکر لونڈیاں بنایا جاتا تھا؟

(د) کیا یہ صورت فریق مقابل کی قومی توہین قرار نہیں دی جاسکتی؟ اور کیا یہ صورت دوسرے فریق کے دلوں میں اسلام سے نفرت کا باعث نہیں بنتی؟ اور کیا اس سے وہی صورت واقع نہیں ہوگی جو آج ہمارے اور ہندوؤں کے درمیان گزشتہ فسادات

کی وجہ سے موجود ہے؟

(س) - اگر یہ حکم اب بھی اسی طرح ہے تو ہندوستان سے جنگ کی صورت میں مسلمان عورتوں کے ساتھ ہمارا سلوک کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اپنے وطن کے تحفظ کے لئے ہمارے ہندوستانی بھائی ہمارے خلاف ضرور صف آرا ہونگے؟

(س) کیا لونڈیوں سے قوم میں شہوانی جذبات ترقی پذیر نہیں ہوتے؟ اور آئندہ کیا گارنٹی اس امر کی ہے کہ ان کی عدم موجودگی میں جذبات پر قابو پایا جا سکے؟ شہوانی جذبات کی اس فراوانی اور حیوانیت کے اس غلبہ کو اسلام کا مزاج تو پسند نہیں کر سکتا۔

جواب :- (۱) فقہائے اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مرگیا ہو وہ وارث نہیں ہوتا بلکہ وارث اس کے چچا ہوتے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس میں شیعوں کے سوا کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا ہے اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن و حدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا جسے فقہاء کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا قرار دیا جا سکے۔ لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں، اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔ ویسے بھی یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ پوتا بہرحال اپنے باپ کے واسطے ہی سے دادا کے مال میں حق دار ہو سکتا ہے نہ کہ براہ راست خود۔ اسی طرح بہو اپنے شوہر کے واسطے سے خسر کے مال میں سے حصہ پا سکتی ہے نہ کہ براہ راست خود۔ اگر ایک شخص کا بیٹا اس کی زندگی میں مرجائے اور وہ شادی شدہ نہ ہو، تو آپ خود مانیں گے کہ اس کا حصہ ساقط ہو جائے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ اس شخص کے مرنے پر اس کے ترکہ میں سے اس کے فوت شدہ بیٹے کا حصہ بھی نکالا جائے اور پھر اس کی میراث اس کی ماں اور اس کے بھائیوں وغیرہ کو پہنچائی جائے۔ اسی طرح اگر اس فوت شدہ لڑکے کی کوئی بیوی موجود ہو تو آپ خود مانیں گے کہ وہ اپنے خسر کے ترکہ میں سے حصہ پانے کی مستحق نہیں ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کا نکاح ثانی ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔

پھر آپ کو کیوں اصرار ہے کہ صرف اس کا بیٹا موجود ہونے کی صورت میں اس کا حصہ ساقط نہ ہو بلکہ وہ اس کے بیٹے کو پہنچے ؟

رہا یتیم کی پرورش کا سوال، تو شریعت کی رو سے اس کے چچا اس کے ولی ہوتے ہیں، اور ان پر اس کا حق ہے کہ وہ اس کی پرورش کا انتظام کریں۔ نیز شریعت نے وصیت کا حکم اسی لیے دیا ہے کہ اگر کوئی مرنے والا اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو اور اس کے خاندان میں کچھ لوگ مستحق موجود ہوں تو وہ ان کے حق میں وصیت کرے۔ ۱/۳ حصہ مال کی حد تک وہ وصیت کر سکتا ہے، اور اس میں یہ گنجائش موجود ہے کہ اگر وہ کوئی یتیم پوتا چھوڑ رہا ہے، یا کوئی بیوہ بہو چھوڑ رہا ہے جو بے سہارا ہو، یا کوئی بیوہ بھاوج یا غریب بھائی یا بیوہ بہن چھوڑ رہا ہے تو ان کے لیے وصیت کر جائے۔ یہ گنجائش اسی لیے رکھی گئی ہے کہ قانونی وارثوں کے سوا خاندان میں جو لوگ مدد کے محتاج ہوں ان کی مدد کا انتظام کیا جا سکے۔

۲۔ لونڈیوں کے بارے میں میں اپنی کئی کتابوں میں مفصل بحث کر چکا ہوں۔ آپ میری کتاب تفہیمات حصہ دوم اور رسائل و مسائل ملاحظہ فرمائیں۔ نیز تفہیم القرآن میں سورۂ نساء کے حواشی دیکھیں۔ امید ہے کہ آپ کے تمام شبہات دور ہو جائیں گے۔ پھر بھی اگر کوئی شبہ رہ جائے تو آپ لکھ کر مجھ سے پوچھ سکتے ہیں۔

تعلیم قرآن کے لیے تفسیروں کے بجائے "پروفیسر"

سوال:۔ میں مدرسہ مظاہر العلوم کا فارغ التحصیل ہوں۔ میرا عقیدہ علمائے دیوبند و مظاہر العلوم سے وابستہ ہے مگر ساتھ ساتھ اپنے اندر کافی وسعت رکھتا ہوں۔ جہاں مجھے بھلائی معلوم ہو جائے وہاں حتی الامکان اس میں حصہ لینے کا رجحان رکھتا ہوں۔ اسی وجہ سے جماعت اسلامی کے ساتھ قلبی ربط رکھتا ہوں، اخبار کوثر اور لٹریچر کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں، مولانا ابو اللیث کی زندگی کو

قریب سے دیکھ چکا ہوں۔ علمائے دیوبند اور آپ کے درمیان جو کشیدگی پیدا ہو گئی ہے اس کا بھی مجھے علم ہے اور اس کی وجہ سے میری طبیعت پریشان ہے۔ میں نے ترجمان القرآن کے وہ شمارے پڑھے ہیں جن میں حکیم گنگوہی صاحب کے اعتراضات کے جوابات آپ نے بہ نفس نفیس اور مولانا امین احسن صاحب نے دیئے ہیں۔ انہیں پڑھتے ہی میں نے حضرت استاذ مفتی .... کی خدمت میں جوابی لفافہ بھیجتے ہوئے لکھا کہ میری نظر میں ایک ہی جماعت اسلامی موجودہ وقت میں حزب اللہ معلوم ہوتی ہے اور دل چاہتا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ کام کروں، مگر ساتھ ساتھ معلوم ہوا کہ آپ حضرات کو جماعت اسلامی سے شدید اختلاف ہے۔ لہٰذا آپ مولانا مودودی کے وہ خیالات ان کی کتابوں سے نقل فرمائیں جو اہل سنت والجماعت کے خلاف ہوں۔ چنانچہ انہوں نے "کشف الحقیقۃ" نامی رسالہ بھیج دیا۔ میں اس کا مطالعہ کر چکا ہوں۔

اس رسالے میں چند ایسی عبارات درج ہیں جن کے متعلق مجھے بھی اشتباہ ہوا۔ چنانچہ میں نے تنقیحات حاصل کی اور اس میں وہ عبارات مل گئیں جو مفتی صاحب نے نقل کی تھیں۔ اب میں ان عبارات کے متعلق آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ آپ کی ان سے مراد کیا ہے۔ آپ کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر جواب دیں تاکہ میرے اور میرے دو تین رفقاء کے شکوک رفع ہو سکیں۔ اس وقت تنقیحات میرے سامنے موجود ہے اور قابل غور عبارات یہ ہیں:۔

(۱) "قرآن کے لیے کسی تفسیر کی حاجت نہیں، ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے جس نے قرآن کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہو" (ص ۱۹۳)۔ ساری عبارت نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ واضح فرمائیے کہ اس عبارت کا مطلب کیا ہے؟ نفی تفسیر سے کونسی تفسیر کی نفی مراد ہے؟ کیا اُس تفسیر کی نفی مراد ہے جو اسرائیلیات پر مشتمل ہو؟ یا موضوع حدیث سے کسی آیت کی تفسیر کی گئی ہو؟ اور پروفیسر کو غائر مطالعہ کیا بغیر احادیث و آثار صحابہ

تابعین کے حاصل ہو سکتا ہے؟ یا اگر نہیں حاصل ہو سکتا ہے تو تفسیر کی حاجت کیوں نہیں؟

(۲) "قرآن اور سنتِ رسول کی تعلیم سب پر مقدم ہے مگر تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں سے نہیں" (صـ۱۱۲)۔ اس عبارت کو خواہ ماقبل و مابعد سے ملایا جائے یا قطع و برید کر کے الگ کر لیا جائے، بظاہر اس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم و احادیث نبویہ کی تعلیم مفسرین و محدثین حضرات کی تعلیم سے نہ لی جائے، بلکہ براہ راست ان سے مطالب اخذ کیے جائیں۔ اگر یہ مطلب ہے تو آپ کو معلوم ہے کہ صحابۂ کرام کو بھی براہ راست اخذِ مطالب کی اجازت نہ تھی، بلکہ وہ بھی محتاجِ تفسیرِ رسول تھے۔ بعض صحابہ نے بعض سے آیات کے مطالب سیکھ لیے۔ تو پھر آج کس طرح بغیر تفسیر مفسرین متقدمین قرآنِ حکیم کے مطالب اخذ کئے جا سکتے ہیں؟ اس مقام پر اگرچہ آپ نے یونیورسٹی کو مخاطب کیا ہے مگر ان کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ قرآن و سنتِ رسول کی تعلیم کو لازم قرار دے کر ان کے مطالب بغیر تفسیر و حدیث کے متقدم ذخیروں کے اخذ کریں۔ کیا بچہ بغیر والدین کے خود بخود بولی سیکھ سکتا ہے؟ بہرکیف اگر یہ مطلب ہو جو بظاہر صاف معلوم ہوتا ہے تو بجائے اصلاح کے بہت نقصان دہ ہے۔

(۳) "وہ ابھی تک اصرار کر رہے تھے کہ ترکی قوم میں وہی فقہی قوانین نافذ کیے جائیں جو شامی اور کنز الدقائق میں لکھے ہوئے ہیں"۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ شامی وغیرہ کتبِ فقہ میں اسلامی قوانین نہیں لکھے ہوئے ہیں؟ کیا وہ فقہائے اسلام کے خود ساختہ قوانین ہیں جو کہ قرآن و حدیث کے مخالف ہیں؟ بہرکیف اس کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟ ان کتابوں میں یقیناً بعض ایسے مسائل ہیں جو مرجوح ہیں مگر ان سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ ان میں سارے مسائل قوانینِ اسلام کے خلاف ہیں۔ کیا ان میں جزئیات کے علاوہ مسلمانوں کی تنظیم اور اتحاد وغیرہ کا ذکر بسیط نہیں ہے؟ اگر ہے تو ان میں کیا کمی ہے؟

امید ہے کہ تکلیف فرما کر ہمیں اطمینان دلائیں گے!

جواب :- میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ میری جن عبارات سے آپ کے دل میں شبہ پیدا ہوا تھا ان کا مفہوم آپ نے خود مجھ ہی سے دریافت فرما لیا۔ اہلِ حق کا یہی طریقہ ہے کہ قائل کی مراد پہلے خود قائل ہی سے پوچھی جائے، نہ یہ کہ بطورِ خود ایک مطلب لیکر اس پر فتویٰ جڑ دیا جائے۔

عبارات ۱ و ۲ سے میری مراد کیا ہے، اس کو سمجھنے میں آپ کو اور آپ جیسے دوسرے لوگوں کو جو دقت پیش آتی ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ آپ لوگ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے ماحول سے، ان کے نصابِ تعلیم سے، اور ان کے اندر گمراہی کی پیدائش کے بنیادی اسباب سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔ آپ لوگ ان درسگاہوں کو اپنے دینی مدارس پر قیاس کرتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ جس طرح آپ کے مدرسوں میں کوئی مولوی صاحب آسانی سے بیضاوی اور جلالین اور ترمذی پڑھا لیتے ہیں اسی طرح ان کالجوں میں بھی پڑھا سکتے ہونگے۔ اسی لیے آپ کو میری یہ بات بڑی انوکھی معلوم ہوئی کہ میں تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں کے بجائے ان کا کوئی بدل ان کالجوں کے لیے تجویز کر رہا ہوں۔ لیکن میں آپ کے دینی مدارس کی طرح ان کالجوں اور یونیورسٹیوں سے بھی واقف ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہاں کس قسم کا ذہنی ماحول پایا جاتا ہے اور ان کے طلبہ کن افکار و نظریات کی آب و ہوا میں نشو و نما پاتے ہیں۔ میں نے خود ان کتابوں کو پڑھا ہے جو مذہبی تخیل کی جڑوں تک کو انسان کے ذہن سے اکھاڑ پھینکتی ہیں اور سراسر ایک ملحدانہ نظریۂ کائنات و انسان اس طرح آدمی کے ذہن میں بٹھا دیتی ہیں کہ آدمی اسے بالکل ایک معقول نظریہ سمجھنے لگتا ہے۔ میں نے تفسیر قرآن اور شرح حدیث اور فقہ کی پرانی کتابوں کو بھی پڑھا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ جدید زمانے کے علوم پڑھنے والے لوگوں کے ذہن میں شکوک و شبہات کے جو کانٹے چبھے ہوئے ہیں، صرف یہی نہیں کہ ان کتابوں میں ان کو نکال دینے کا کوئی سامان نہیں ہے، بلکہ ان میں قدم قدم پر وہ چیزیں ملتی ہیں جو نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے دل میں مزید شبہات پیدا کر دینے والی ہیں اور بسا اوقات ان کی وجہ سے ایک متشکک شک کے مقام سے آگے بڑھ کر جحود و انکار کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ان جدید درسگاہوں میں پرانے طرز کے معلمِ دینیات اپنے پرانے طریقوں اور ذخیروں

سے دین کی تعلیم دے کر اس کے سوا کوئی خدمت انجام نہ دے سکے کہ خود بھی مضحکہ بنے اور دین کا بھی استخفاف کرایا۔ یہ ساری چیزیں میری نگاہ میں ہیں۔ اسی بنا پر میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ ان درسگاہوں کے لیے جب تک قرآن کی ایسی تفسیریں اور حدیث کی ایسی شرحیں تیار نہ ہو جائیں جن میں اُن تمام اہم سوالات کا جواب مل سکتا ہو جو نئے زمانے کے علوم پڑھنے والوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں، اس وقت تک کوئی خاص کتاب داخلِ نصاب نہ کی جائے بلکہ تلاش کر کے ایسے استاد رکھے جائیں جو قرآن و حدیث میں گہری بصیرت رکھتے ہوں اور علوم جدیدہ سے بھی واقف ہوں، اور وہ تفسیر کی کوئی کتاب پڑھانے کے بجائے براہِ راست قرآن کا درس دیں اور حدیث کی کوئی شرح پڑھانے کے بجائے براہِ راست احادیث نبوی کی تعلیم دیں تاکہ طلبہ کو اُن بحثوں سے سابقہ ہی نہ پیش آئے جو اُن کے لیے ابتداءً موجبِ توحش ہوا کرتی ہیں۔

اِس وقت تو پھر بھی کالجوں کا ماحول پہلے سے بہت زیادہ بہتر ہو چکا ہے، مگر جس زمانے میں میں نے "تنقیحات" کے یہ دونوں مضمون "ہمارے نظامِ تعلیم کا بنیادی نقص" اور "مسلمانوں کے لیے جدید تعلیمی پالیسی اور لائحہ عمل" لکھے تھے (یعنی ۱۹۳۶ء) اُس وقت تو علی الاعلان دین کا مذاق اُڑایا جا رہا تھا۔ "نگار" کی طرح کے پرچے یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلبہ میں تیزی کے ساتھ الحاد پھیلا رہے تھے اور اشتراکی تحریک وبا کی طرح نوجوان نسل کو متاثر کرتی چلی جا رہی تھی۔ آپ کے مذہبی مدارس میں پڑھنے پڑھانے والوں کو نہ اس صورتِ حال کا کوئی اندازہ تھا اور نہ انہوں نے اپنے وقت کا ایک لمحہ اس مرض کے اسباب کی تشخیص کرنے اور اس کا علاج سوچنے پر صرف کیا۔ میں نے راتوں اپنی راتوں کی نیند حرام کر کے اِن مسائل پر غور کرتا رہا اور وقت کے تعلیمی راہنماؤں کے سامنے ان کے نظامِ تعلیم کا پورا تجزیہ کر کے میں نے وہ اسباب صاف صاف پیش کر دیئے جو الحاد کی بڑھتی ہوئی تشویشناک رَو کے اصل موجب تھے۔ اِس کے ساتھ میں نے ان کو یہ بھی بتایا کہ اگر آپ فی الواقع اس الحاد کی پیدائش کو روکنے کے خواہشمند ہیں تو اپنے نظامِ تعلیم میں یہ اصلاحات کیجیے۔ اس سلسلہ میں جب کالجوں میں موزوں دینی نصاب تجویز کرنے کا سوال پیش آیا تو میں نے

اپنی حد تک اُس پورے ذخیرے پر نگاہ ڈالی جو تفسیرِ قرآن، شرحِ حدیث اور فقہ و کلام کے موضوعات پر موجود تھا، اور مجھے ایک کتاب بھی ایسی نظر نہ آئی، خواہ وہ اردو میں ہو یا عربی میں، یا انگریزی میں، جسے ان درسگاہوں کے لیے تجویز کیا جا سکے ـــــ اور اس وقت کیا، میں آج آپ کے ان مفتیوں سے پوچھتا ہوں کہ ذرا کسی ایسی کتاب کا نام لیجیے جسے اطمینان کے ساتھ ان طلبہ کے ہاتھ میں دیا جا سکے ـــــ آخر کار اس پیچیدگی کا حل مجھے اس کے سوا کچھ نظر نہ آیا کہ ہر دست جو چند گنے چنے آدمی ہماری قوم میں ایسے موجود ہیں جو کالجوں کی مخلوق کو دین کی تعلیم دینے کے اہل ہیں، اُن کی خدمات حاصل کر کے چند مرکزی درس گاہوں میں تعلیمِ دین کا انتظام کیا جائے، پھر جو کھیپ ان کے فیضِ تعلیم سے تیار ہو کر نکلے گی اس میں سے ایسے معلّمین نکل آنے کی توقع کی جا سکتی ہے جو دوسری درسگاہوں کے کام آسکیں اور کالجوں کے لیے موزوں نصاب بھی تیار کر سکیں۔

میری اس تشریح کے بعد اب ذرا آپ پھر تنقیحات کے ان دونوں مضمونوں کو اوّل سے آخر تک پڑھیے۔ اس کے بعد آپ کو اندازہ ہو گا کہ آج پندرہ سال بعد ان مضمونوں کی جو داد مجھے دیوبند اور مظاہر العلوم کے دارالافتاؤں سے ملی ہے وہ کس درجہ علم و بصیرت اور خدا ترسی پر مبنی ہے۔ میں حیران ہوں، اگر یہ لوگ اِن معاملات کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو آخر کس نے ان پر فرض کر دیا ہے کہ ان پر اظہارِ رائے فرمائیں اور وہ بھی بشکل فتویٰ؟

رہی تیسری عبارت تو اس سے جو شبہ آپ کے دل میں پیدا ہوا ہے اور جو شبہ دیوبند و مظاہر العلوم کے مفتیوں نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اس کی تردید خود اسی مضمون سے ہو سکتی تھی جس میں وہ عبارت واقع ہوئی ہے۔ بشرطیکہ مضمون کو بغور پڑھا جاتا۔ آپ کے پاس اگر تنقیحات موجود ہے تو اس میں وہ مضمون نکالیں جس کا عنوان ہے "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" اسے دیکھیے۔ اور اس نظر سے دیکھیے کہ آیا اس میں مسئلہ زیرِ بحث یہ ہے کہ فقہ اسلامی کی معتبر کتابیں کونسی ہیں اور ایک سلطنت میں کونسی فقہ کس طرح جاری ہونی چاہیے، یا یہ ہے کہ موجودہ ترکی

میں الحاد و بیدینی اور اندھی مغربیت کے فروغ پانے کی وجہ کیا ہے ؟ اگر کسی شخص میں کسی مضمون کو پڑھ کر اس کا موضوع سمجھنے کی کچھ بھی صلاحیت ہو تو وہ بیک نظر معلوم کر لے گا کہ میرے اس مضمون کا اصل موضوع دوسرا ہے نہ کہ پہلا۔ پھر یہ کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ ایک موضوع پر کلام کرتے ہوئے ضمناً اگر ایک فقرہ میرے قلم سے کسی دوسرے موضوع سے متعلق نکل گیا ہے تو آپ صرف اُس ایک ہی فقرے کی بنا پر فیصلہ فرمالیں کہ اس دوسرے موضوع کے بارے میں میرا مذہب و مسلک کیا ہے ؟ اور اس پر مزید ستم یہ ہے کہ آپ اُس فقرے سے میرا مذہب و مسلک بھی مستنبط فرماتے ہیں تو وہ جس کی تردید میری بیسیوں تحریریں کر رہی ہیں۔ آپ کو اگر یہ معلوم کرنا تھا کہ فقہ میں میرا مسلک کیا ہے اور سلف کی فقہی کتابوں کے بارے میں میری کیا رائے ہے تو آپ کو میری وہ تحریریں دیکھنی چاہیے تھیں جو میں نے فقہ کے موضوع پر لکھی ہیں۔ اور کچھ نہیں تو صرف میرا وہ رسالہ ہی پڑھ لیتے جو 'اسلامی قانون' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، تو آپ کے وہ سارے شبہات رفع ہو جاتے جن کی عمارت تنقیحات کے صرف ایک فقرے پر تعمیر ہوئی تھی۔

اس سلسلے میں اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات میں اور عرض کر دوں۔ علماء کرام علوم دینیہ میں جیسی کچھ بھی نظر رکھتے ہوں، بہرحال دو چیزیں ایسی ہیں جن سے وہ قریب قریب بالکل ناواقف ہیں۔

(۱) انہیں کچھ خبر نہیں ہے کہ قریب کے زمانہ میں مختلف مسلمان ملکوں میں مغربیت اور اسلامیت کے درمیان کس کس طرح کی کشمکش ہوئی ہے اور اس میں ہر جگہ اسلامیت کی شکست اور مغربیت کے غلبہ و فروغ کے اسباب کیا ہیں اور اس افسوسناک نتیجے کے رونما ہونے میں خود علماء اور حاملانِ دین کی اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا کتنا دخل ہے۔

(۲) انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ دنیا کے موجودہ تمدن میں اگر ہم ایک اعلیٰ درجہ کی ترقی یافتہ اسلامی ریاست کا نظام خالص اسلامی اصولوں پر چلانا چاہیں تو ہمیں کس قسم کے مسائل سے سابقہ پیش آئے گا اور اُن مسائل کو حل کرنے میں سلف کی چھوڑی ہوئی علمی میراث کس حد تک ہمارے

کام آسکے گی اور اُس حد سے آگے ہمارا کام اجتہاد کے بغیر کیوں نہ چل سکے گا؟ میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر ان دونوں باتوں سے علماء کی غفلت و بے خبری کا حال وہ نہ ہوتا جو اس وقت ہے، تو انہیں میری بہت سی باتوں کو سمجھنے میں وہ مشکلات پیش نہ آتیں جو اب آ رہی ہیں۔ پھر غضب یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ اپنے علم و واقفیت کی اِس کمی کو محسوس فرماتے اور اسے دُور کرنے کی کوشش کرتے، انہیں اُلٹا اُس شخص پر غصہ آتا ہے جو ایک طرف اُن کی اس خامی کو دُور کرنے کی فکر کرتا ہے اور دوسری طرف دین کو اُس نقصان سے بچانا چاہتا ہے جو اِس خامی کی بدولت پہنچ رہا ہے اور آگے پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اُن کی اس روش کا انجام کیا ہوگا۔ روسی ترکستان میں اس کا انجام یہ ہو چکا ہے کہ اُشتراکیوں نے پہلے اِس طرح کے علماء کو استعمال کر کے اُن مٹھی بھر مصلحین کو ختم کرایا جو اشتراکیت کے مقابلے میں ایک کامیاب دینی تحریک چلانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ پھر عوام الناس کو اپنے اثر میں لا کر ان کے ہاتھوں علماء کرام کو بھی ختم کرا دیا اور علماء کے ساتھ ساتھ خود دین کا جنازہ بھی اٹھوا دیا۔ اب اِسی داستان کا اعادہ یہاں ہوتا نظر آ رہا ہے۔ جو لوگ منتفرنجین اور ملاحدہ کے مقابلے میں یہاں دین کا علم اُٹھانے کی قوت و صلاحیت رکھتے ہیں۔ علماء کا ایک گروہ کثیر اُن کے مقابلے میں منتفرنجین و ملاحدہ کے ہاتھ مضبوط کر رہا ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ لوگ علماء کی مدد سے اُن کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو اس کے بعد جو نتائج سامنے آئیں گے انہیں دیکھنے کے لیے ہم تو موجود نہ ہوں گے، مگر یہ حضرات علماء اور ان کی آئندہ نسلیں اپنی آنکھوں سے دیکھیں گی کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں اپنے حق میں اور اس دین کے حق میں کیسے کچھ کانٹے بوئے ہیں۔

مولانا حسین احمد صاحب کا ایک فتویٰ

سوال: جناب مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے ایک پمفلٹ بموسوم "مسلمان اگرچہ بے عمل ہو مگر اسلام سے خارج نہیں ہے" شائع کرایا ہے جس میں

یہ ثابت کیا ہے کہ آپ کا مسلک اہل سنت والجماعت کے مسلک کے بالکل خلاف ہے اور احادیث صحیحہ اور آیات صریحہ کے بالکل منافی ہے۔ اور لکھا ہے کہ آپ اعمال کے جزو ایمان ہونے کے قائل ہیں جیسا کہ خوارج اور معتزلہ کا عقیدہ ہے۔ اور آپ اس عقیدہ کو شافعیہ اور محدثین کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ شافعیہ و محدثین اعمال کو ایمان کا جزو متقوم نہیں بلکہ جزو متمم و مکمل کہتے ہیں از راہ کرم اس مسئلہ کے متعلق اپنا عقیدہ بالوضاحت تحریر فرماویں اور ترجمان القرآن میں شائع فرماویں انھوں نے آپ کی مندرجہ ذیل عبارات کو بطور دلیل پیش کیا ہے:۔

(۱) "وہ لوگ جن کو عمر بھر کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ حج بھی کوئی فرض اُن کے ذمہ ہے، دنیا بھر کے سفر کرتے پھرتے ہیں، یورپ کو آتے جاتے حجاز کے ساحل سے بھی گذر جاتے ہیں جہاں سے مکہ صرف چند گھنٹوں کی مسافت پر ہے، اور پھر بھی حج کا ارادہ تک ان کے دل میں نہیں گزرتا، تو وہ قطعاً مسلمان نہیں ہیں۔ جھوٹ کہتے ہیں اگر اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور قرآن سے جاہل ہے جو انہیں مسلمان سمجھتا ہے۔" (خطبات ص ۱۰۱)

(۲) "اس سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کے بغیر نماز روزہ اور ایمان کی شہادت سب بے کار ہیں۔ کسی چیز کا بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا" (خطبات ص ۱۲۶)

(۳) "ان دو ارکانِ اسلام یعنی (نماز و زکوٰۃ) سے جو لوگ روگردانی کریں اُن کا دعویٰ ایمان ہی جھوٹا ہے" (خطبات ص ۱۲۹)

(۴) "قرآن کی رو سے کلمہ طیبہ کا اقرار ہی بے معنی ہے اگر آدمی اس کے ثبوت میں نماز اور زکوٰۃ کا پابند نہ ہو" (خطبات ص ۱۳۲)

یہ سب حوالہ جات خطبات بار ہفتم کے صفحات کے مطابق ہیں۔

جواب: ایک ظلم تو مولانا حسین احمد صاحب نے کیا کہ اصل کتاب کی عبارات کو پوری طرح پڑھے بغیر، اور خود کتاب کے موضوع و مضمون سے واقفیت حاصل کئے بغیر، محض چند لوگوں کے فراہم کردہ اقتباسات کی بنا پر کتاب کے مصنف کا ایک مسلک مشخص فرما لیا اور اپنی اس تشخیص کا اعلان بھی فرما دیا۔

اس پر دوسرا ظلم آپ کر رہے ہیں کہ مولانا کے اس پمفلٹ کو پڑھنے کے بعد آپ نے خود نہ "خطبات" کو پڑھا، نہ میری کسی اور کتاب سے میرا مسلک معلوم کیا، بلکہ فوراً مجھے جواب دہی کے لئے طلب فرمالیا۔ میری کتاب "خطبات" آپ کی دسترس سے دور نہ تھی، آپ صرف اسی کو اٹھا کر دیکھ لیتے تو آپ کو انہی عبارات کے آس پاس مولانا کے الزامات کا جواب مل جاتا۔ پھر میری کتاب "تفہیمات حصہ دوم" بھی آپ کو اپنے شہر کے دارالمطالعہ جماعت اسلامی میں بآسانی مل سکتی تھی۔ اس کو پڑھ کر آپ کو معلوم ہو جاتا کہ آیا میں خوارج و معتزلہ کا ہم مسلک ہوں یا اہل سنت کا۔

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس طرح کے اعتراضات کی تحقیق کے لئے مجھ سے سوال نہ کیا جائے۔ میں صرف یہ عرض کرتا ہوں کہ جن الزامات کی تحقیق آپ خود تھوڑی سی تکلیف اٹھا کر کر سکتے ہوں ان کے لئے خواہ مخواہ مراسلت میں وقت کیوں صرف کیا جائے۔

خطبات کی جن عبارات پر مولانا نے مجھے خارجی و معتزلی بنایا ہے ان پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ یہ کتاب کوئی فقہ اور علم کلام کی کتاب نہیں ہے، نہ فتوے کی زبان میں لکھی گئی ہے، بلکہ یہ ایک وعظ و نصیحت کی کتاب ہے جس سے مقصود بندگان خدا کو فرمانبرداری پر اکسانا اور نافرمانی سے روکنا ہے۔ اس میں بحث یہ نہیں ہے کہ اسلام کے آخری حدود کیا ہیں جن سے تجاوز کئے بغیر آدمی خارج از ملت قرار نہ پا سکتا ہو، بلکہ اس میں عام مسلمانوں کو دین کا اصل مقصد سمجھانے اور اخلاص فی الطاعت پر ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کیا اس نوعیت کی کتاب میں مجھے عوام سے یہ کہنا چاہیے تھا کہ خواہ تم نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، کچھ بھی ادا نہ کرو، پھر بھی تم مسلمان ہی رہو گے؟ مولانا حسین احمد صاحب کو فتویٰ دینے کا شوق تھا تو وہ ضرور اپنا یہ شوق پورا فرماتے، مگر فتوے دینے سے پہلے انہیں اس چیز کو سمجھ تو لینا چاہیے تھا جس پر وہ فتویٰ لگا رہے تھے۔

پھر اگر مولانا نے محض پیش کردہ اقتباسات پر اکتفا نہ کیا ہوتا بلکہ اصل کتاب کو نکال کر ان عبارتوں کے سابق و لاحق کو بھی دیکھ لیا ہوتا تو مجھے امید نہیں کہ وہ ان پر یہ اعتراضات کرنے کی جرأت فرماتے۔ مثال کے طور پر حج کے متعلق میری اس عبارت کو لیجیے جسے آپ نے سب سے پہلے نقل کیا ہے: "خطبات" میں اس سے پہلے یہ آیت نقل کی گئی ہے کہ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ

غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ[1] - پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ " جو شخص زادِ راہ اور سواری رکھتا ہو جس سے وہ بیت اللہ تک پہنچ سکے، اور پھر وہ حج نہ کرے، تو اس کا اِس حالت پر مرنا اور یہودی یا نصرانی ہو کر مرنا یکساں ہے " پھر اسی مضمون کی ایک اور حدیث نقل کرنے کے بعد حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ " جو لوگ قدرت رکھنے کے باوجود حج نہیں کرتے، میرا جی چاہتا ہے کہ ان پر جزیہ لگا دوں۔ وہ مسلمان نہیں ہیں، وہ مسلمان نہیں ہیں " ان ساری چیزوں کو نقل کرنے کے بعد میں نے وہ فقرے لکھے ہیں جو آپ نے مولانا کے پمفلٹ سے نقل فرمائے ہیں۔ اب فرمائیے کہ اِس عبارت پر خارجیت اور اعتزال کا جو فتوے مولانا صاحب نے جڑ دیا ہے اس کی زد کہاں کہاں جا کر پڑتی ہے؟ کیا میں مولانا کو خدا سے اتنا بے خوف فرض کروں کہ یہ سب کچھ پڑھ لینے کے بعد بھی وہ اِس مفتیانہ تیر اندازی کی جسارت کر گزرتے؟

اِسی طرح نماز اور زکوٰۃ سے متعلق میری جو عبارتیں آپ نے مولانا کے پمفلٹ سے نقل فرمائی ہیں اُن کے آگے اور پیچھے میں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اِس مشہور کارنامے کو بھی نقل کیا ہے کہ انہوں نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا۔ اور اس کے ساتھ بکثرت آیات بھی نقل کی ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ[2]۔ کیا اِس سیاق و سباق پر نظر ڈالنے کے بعد بھی خارجیت اور اعتزال کے اس فتوے کو آپ ممکن سمجھ سکتے ہیں جو مولانا کے قلم سے میری ان عبارتوں پر نکلا ہے؟

منکرین حدیث کا ایک اعتراض

سوال - منکرین حدیث مسلم شریف کی ایک روایت پیش کرتے ہیں جس کا مضمون یہ ہے کہ " آنحضرت صلعم کی ام ولد ماریہ قبطیہ سے زنا کرنے کا الزام ایک شخص پر لگایا گیا۔ آپؐ نے حضرت علی

---

[1] لوگوں پر اللہ کا حق ہے کہ جو بیت اللہ تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے، اور جس نے کفر کیا، تو اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

[2] پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے لگیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

کو حکم دیا کہ ملزم کو قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ جب حضرت علی تلوار لیکر اُس شخص کو قتل کرنے گئے تو وہ غسل کر رہا تھا۔ حضرت علی نے دیکھا کہ وہ مخنث تھا۔ آپ واپس چلے آئے اور آنحضرت صلعم کو یہ اقتضاء بتلایا:

اِس حدیث سے حسب ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں :۔

(۱) آنحضرت نے محض الزام کی بناء پر، مقدمہ کی کارروائی کئے بغیر اور ملزم کی صفائی سُنے بغیر، اُس کے قتل کا حکم کیسے دیدیا؟ حالانکہ یہ اسلام کی مجموعی اسپرٹ اور اُن احادیث کے خلاف ہے جن میں اسلام کا عدالتی نظام بیان ہوا ہے۔

(۲) زنا کی سزا دُرّے ہیں یا رجم (اگرچہ منکرینِ حدیث رجم کے قائل نہیں)، پھر قتل کی سزا مذکورہ مقدمہ میں کیوں دی گئی؟

(۳) حضرت علی نے ملزم کو برہنہ کیوں دیکھا؟ حالانکہ آنحضرت صلعم نے کسی کو برہنہ دیکھنے سے کئی احادیث میں منع فرمایا ہے۔

(۴) حافظ ابنِ حجر، ابن جوزی، ملا علی قاری اور دوسرے ناقدینِ حدیث نے جرح و تعدیل کے جو اصول بیان کئے ہیں، اس کسوٹی پر اس حدیث کا کیا مقام ہے؟ اگر متقدمین اپنی پوری احتیاط کے باوجود بہ تقاضائے بشریت، اِس معاملہ میں اس جگہ چُوک گئے ہیں تو کیا متاخرین کو حق نہیں کہ وہ باوجود اہلیت کے، اب اس نقص کو پورا کریں؟

(۵) اس حدیث کے متن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آنحضرت صلعم کا کلام نہیں ہے بلکہ کوئی راوی مقدمہ کی کارروائی بیان کر رہا ہے اور غالباً بعض تفصیلات کے متعلق اس کو بھول ہو گیا ہے کہ وہ پوری کارروائی اپنے الفاظ میں بیان نہیں کر سکا۔

جواب :۔ یہ منکرینِ حدیث دراصل جہل مرکب میں مبتلا ہیں۔ جس چیز کو نہیں جانتے اُسے جاننے والوں سے پوچھنے اور سمجھنے کے بجائے عالم بن کر فیصلے صادر کرتے ہیں اور پھر انہیں شائع کر کے عوام الناس کو گمراہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اُنکی گمراہ کن تحریریں اکثر ہماری نگاہ سے گزرتی رہتی ہیں، اور ان کا کوئی اعتراض ایسا نہیں ہے جس کو دلائل سے ردّ نہ کیا جا سکتا ہو۔ لیکن جس وجہ سے مجبوراً خاموشی اختیار کرنی پڑتی ہے وہ دراصل یہ ہے

کہ یہ لوگ اپنی بحث میں بالعموم بازاری غنڈوں کا سا طرز اختیار کرتے ہیں۔ اِن کے مضامین پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی شخص ایک غلاظت بھری جھاڑو ہاتھ میں لئے کھڑا ہو اور زبان کھولنے کے ساتھ ہی مخاطب کے منہ پر اُس جھاڑو کا ایک ہاتھ رسید کر دے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کے منہ لگنا کسی شریف آدمی کے بس کی بات نہیں ہے، اور نہ اِس قماش کے لوگ اِس لائق سمجھے جا سکتے ہیں کہ ان سے کوئی علمی بحث کی جائے۔

بہرحال ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ جن شریف آدمیوں کے دل میں اِن فتنہ پردازوں کی تحریروں سے کوئی شبہ پیدا ہو جائے اُن کے شبہات رفع کرنے کی کوشش کریں، اگرچہ یہ بات ہماری توقعات کے خلاف ضرور ہے کہ شریف اور معقول لوگ اِن کے بیہودہ طرزِ کلام کو دیکھنے کے باوجود انکی باتوں کو وزن دینے لگیں۔

جس واقعہ کے متعلق آپ نے سوال کیا ہے اس کی اصلیت یہ ہے کہ حضرت ماریۂ قبطیہ کے بارے میں مدینہ کے منافقین نے یہ افواہ اڑادی تھی کہ اپنے چچازاد بھائی سے ان کا ناجائز تعلق ہے۔ رفتہ رفتہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں تک بھی پہنچی۔ آپ نے حضرت علی کو حکم دیا کہ "اذھب فان وجدتہ عند ماریۃ فاضرب عنقہ" "جاؤ اگر تم اُس کو ماریہ کے پاس پاؤ تو اُس کی گردن مار دو"۔ بعید نہیں کہ کہنے والے نے حضورؐ سے یہ کہا ہو کہ وہ وہاں اِس وقت موجود ہے، آپ کسی کو بھیجکر دیکھ لیں، اور اِس پر حضورؐ نے فرمایا ہو کہ اگر وہ وہاں کسی نامناسب حالت میں پایا جائے تو جان سے مار دو۔ اِس حکم کے مطابق حضرت علی جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ وہ ایک حوض میں نہا رہا ہے۔ آپ نے جاتے ہی اُسے ڈانٹا اور ہاتھ پکڑ کر اُسے حوض میں سے کھینچ لیا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص پانی سے بھرے ہوئے حوض میں اُترا ہوا ہو اُس کے بارے میں باہر سے دیکھنے والے کو بیک نظر یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ ننگا ہے یا ستر ڈھانکے ہوئے ہے۔ جب حضرت علی نے اس کو باہر کھینچا تو یکایک آپکی نظر اُس کے ستر پر پڑی اور معلوم ہوا کہ وہ تو مقطوع الذکر ہے۔ آپ نے اُسی وقت اُسے چھوڑ دیا اور آکر حضورؐ کو حقیقت حال بتا دی۔

اب فرمایئے کہ اس واقعہ پر کیا اعتراض ہے اور کس پہلو سے ہے؟ یہ بات بھی مَیں عرض کر دوں کہ سند کے لحاظ سے یہ روایت ضعیف نہیں ہے۔

بعض محدثین نے اس کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ اس شخص کے مخنث ہونے کا حال حضورؐ کو معلوم تھا اور آپ نے حضرت علی کو قتل کا حکم دیکر صرف اِس لئے بھیجا تھا کہ جب حضرت علی یہ حکم اسے سُنائیں گے تو وہ اپنا راز خود کھول دیگا اور اس طرح سب

لوگوں کو معلوم ہو جائیگا کہ یہ ساری افواہیں بالکل بے بنیاد ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر یہ بات نہ بھی ہو تب بھی واقعہ بجائے خود ناقابلِ اعتراض ہے۔ کیا کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اگر وہ اپنی آنکھوں سے رسول خدا کی بے حرمتی ہوتے دیکھے، اور وہ بھی ایسی سخت بے حرمتی، تو وہ ایسے آدمی کو قتل کر دے؟ اپنی ماں، یا بہن یا بیوی کے ساتھ ایسا فعل ہوتے دیکھنا بھی دنیا میں ایک معقول وجہ اشتعال مانا جاتا ہے، کجا کہ پیغمبر خدا کے بستر پر ایسا معاملہ دیکھا جائے۔ تاہم جس شخص کو اس پر اعتراض ہو اس سے پوچھیے کہ اگر اس کی بیوی کے متعلق ایسی ایک گھناونی خبر اسے پہنچے تو اس کا ردِ عمل کیا ہوگا؟

"طلوع اسلام"

سوال - ابھی ابھی ایک پرچہ "طلوع اسلام" نظر سے گذرا۔ یہ پرچہ قریب قریب اُن مضامین پر مشتمل ہے، جن میں آپکی کتاب "مرتد کی سزا اسلامی قانون میں" کی قرآن کے رو سے تردید کی گئی ہے۔ پرچے کے جملے ایسے ہیں جیسے برسوں کی چھپی ہوئی دشمنی کا بدلہ نکال رہے ہوں۔

اس پرچے کے آخر میں یعنی آخری صفحہ پر مفتی محمد شفیع کے ایک تازہ فتوے کی جسے مولانا سید سلیمان ندوی کی تائید حاصل ہے، تردید بھی کی گئی ہے۔

ہماری سمجھ میں یہ نہ آسکا کہ آخر کس ہستی کو یہ لوگ مستند خیال کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آئندہ ماہ کے "ترجمان القرآن" میں آپ اس کا جواب لکھ رہے ہیں یا نہیں؟ اگر کسی دوسرے پرچے میں اس کا جواب لکھ رہے ہوں تو ہمیں آگاہ کر دیں تاکہ جو لوگ اس پرچے (طلوع اسلام) کو پڑھ کر آپ کی طرف سے بددل ہو گئے ہیں ان کا ازالہ کر دیا جائے۔

جواب - ہمیں تعجب ہے کہ "طلوع اسلام" کے تازہ ارشادات پر آپ نے ہمیں توجہ دلانے کی ضرورت کیوں محسوس فرمائی۔ یہ لوگ تو مسلسل دس سال سے ہم پر ایسی ہی عنایات کی بارش کئے جا رہے ہیں، اور کراچی سے نیا "طلوع اسلام" شروع ہونے کے بعد تو شاید کوئی مہینہ ایسا نہیں گزرا ہے جس میں یہ سلسلہ بارش نہ ہوئی ہو۔ پھر اس موقع پر کیا خاص بات ایسی پیش آ گئی کہ آپ نے ہم سے ان کے جواب کی فرمائش کرنا ضروری سمجھا؟ کیا آپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ترجمان القرآن کے صفحات میں آجتک ہم نے کبھی ان حضرات کو مخاطب نہیں کیا ہے؟

ہم توقع رکھتے تھے کہ اُن کے حملوں پر ہمارے توجہ نہ کرنے کی وجہ ہر معقول آدمی، جو طلوع اسلام اور ترجمان القرآن، دونوں کو پڑھتا ہے، خود سمجھ لے گا۔ لیکن آپ کے اِس خط سے محسوس ہُوا کہ شاید بعض لوگوں کے لئے اس سلسلہ میں ہماری طرف سے کچھ تصریح کی ضرورت بھی ہے۔ لہٰذا یہاں دو اصولی باتیں عرض کی جاتی ہیں جن سے آپکو نہ صرف طلوع اسلام کے معاملہ میں، بلکہ اُن بہت سے دوسرے لوگوں کے معاملہ میں بھی ہمارے سکوت کی وجہ معلوم ہو جائے گی جو اخبارات، رسائل اور پمفلٹوں میں ہم پر آئے دن حملے کرتے رہتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ جو لوگ کسی شخص کی عبارات کو توڑ مروڑ کر، اور ان کے ساتھ کچھ اپنی من گھڑت باتیں ملا کر، پہلے اسکی ایک غلط پوزیشن بناتے ہیں اور پھر خود اپنی ہی بنائی ہوئی اُس پوزیشن پر حملہ کرتے ہیں، اُن کی اس حرکت سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ تین قسم کی کمزوریوں میں مبتلا ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اخلاق و ذہن کے اعتبار سے نامرد ہیں۔ ان میں یہ جرأت نہیں ہے کہ آدمی کی اصلی پوزیشن پر حملہ کر سکیں، اس لئے پہلے وہ اس کی ایک ایسی کمزور پوزیشن بنانے کی کوشش کرتے ہیں جس پر حملہ کرنا آسان ہو، پھر بہادروں کی سی شان کے ساتھ اس پر دھاوا بول دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ بے حیا ہیں۔ اُنہیں اِس کی کچھ پروا نہیں ہے کہ جن لوگوں کو اُس شخص کی اصلی پوزیشن معلوم ہے وہ ان کی اِس کاریگری کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ ان کی نگاہ میں بس یہ کامیابی کافی ہے کہ کچھ ناواقف لوگوں کو وہ غلط فہمی میں مبتلا کر دیں۔ تیسرے یہ کہ وہ خدا کے خوف اور آخرت کی جواب دہی کے احساس سے بالکل فارغ ہیں۔ ان کے لئے جو کچھ ہے بس پبلک ہے جسے دھوکا دیکر اگر وہ اپنا کام نکال لے گئے تو گویا انہیں فلاح حاصل ہو گئی۔ اوپر کوئی عالم الغیب اگر جانتا ہے کہ انہوں نے کن افترا پردازیوں سے اپنا کام نکالا ہے، تو جانا کرے۔ یہ نامردی، اور یہ بے حیائی، اور یہ ناخدا ترسی جن لوگوں کے طرزِ عمل میں صاف جھلک رہی ہو، ان کو اپنا مدِ مقابل بنانے کے لئے ہم کسی طرح تیار نہیں ہیں۔ وہ اگر اپنی ساری عمر بھی ہم پر حملے کرنے میں کھپا دیں تو شوق سے کھپاتے رہیں۔ ہم کبھی اُن کا جواب دینگے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قومی مسائل ہوں یا علمی مسائل، ان میں اگر آدمیت اور معقولیت کے ساتھ گفتگو کی جائے تو دلیل کا جواب دلیل ہی سے دیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کے مباحثے مفید و نتیجہ خیز بھی ہوتے ہیں اور دلچسپ بھی۔ ان میں ہم احقاقِ حق اور افہام و تفہیم کے لئے بھی حصہ لینے کے لئے تیار ہیں اور طلبِ علم اور طلبِ حق کے لئے بھی۔ ہمیں اپنی ہی بات منوانے پر اصرار نہیں، دوسرے کی بات معقول و مدلل ہو تو ہم کھلے دل سے اس کو مان لیں گے۔ مگر جو لوگ دلیل سے کم اور گالی سے زیادہ کام لیں، جو زبان کھولتے ہی پہلے آدمی کی عزت پر حملہ کریں، جن کی تقریر کا اصل مدعا آدمی کو بدنیت اور

مطبوعات

تدبر قرآن | تالیف جناب مولانا امین احسن اصلاحی۔ قیمت مجلد مع گردپوش دو روپیہ آٹھ آنے مکتبہ یثرب، ۱۰۔ اے، دی مال، لاہور

قرآن ہدایتِ نوعِ انسانی کے موضوع پر اتنی اونچی کتاب ہے اور اتنے وسیع الاثر بنیادی مسائلِ حیات سے بحث کرتی ہے کہ اس کے خزائنِ معنی سے استفادہ کرنے کے لئے قدم قدم پر تفکر و تدبر کی کنجیوں سے قفل کھولنے پڑتے ہیں۔ مولینا امین احسن اصلاحی، جن کا موضوعِ فکر و تحقیق ہی کئی سال سے قرآن مجید رہا ہے، اپنی اس کتاب کے ذریعے تفکر و تدبر کی کنجیاں عوام کے ہاتھ میں دے رہے ہیں اور ان کنجیوں کا استعمال سکھاتے ہیں۔

یہ کتاب اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ اس میں بیک وقت اُن دو بظاہر متضاد حقیقتوں کی تطبیق کی گئی ہے کہ ایک طرف قرآن کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ "ولقد یسرنا القرآن" اور دوسری طرف مطالبہ کیا گیا ہے کہ "افلا یتدبرون القرآن"۔ بات وہی ہے کہ "دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں"؟

یہ کتاب بڑے گہرے تجزیے کے ساتھ اُن وجوہ و اسباب کو سامنے لاتی ہے جن کے زیرِ اثر قرآن کو ہزاروں لوگ پڑھتے ہیں لیکن وہ چیز نہیں پاتے جس کے لئے قرآن کو پڑھنے کی ضرورت ہے۔ اسی سلسلے میں عہدِ ماضی کے دفترِ تفسیر کا جائزہ لیکر مختلف مدارسِ فکر کا امتیاز دکھایا گیا ہے اور ساتھ کے ساتھ حال کے فتنہ پرداز مفسرین کے فسادِ ذہنی کی نقاب کشائی بھی کی گئی ہے۔

کتاب نہ صرف ایک جانے پہچانے محقق کی لکھی ہوئی ہے بلکہ وہ محقق ایک بلند پایہ ادیب بھی ہے جس کے قلم کی شگفتگی نے انتہائی خشک بحثوں کو دماغوں کے لئے "زود ہضم" اور "سائغاً للشاربین" بنا دیا ہے۔

بقیہ صلاہ ــ بے ایمان ثابت کرتا ہو، اور جنہیں کوئی ذلیل سے ذلیل تہمت تراشنے میں بھی تامل نہ ہو، ان کو کسی علمی یا قومی مسئلے میں بحث کا مخاطب بنانا کسی شریف اور معقول آدمی کے لئے تو ممکن نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کی باتوں کا جواب دینے کی فرمائش جو لوگ ہم سے کرتے ہیں، ان کی اس فرمائش سے ہمیں شبہ ہوتا ہے کہ وہ یا تو ہمیں بھی اسی قماش کا آدمی سمجھتے ہیں اور یہ ہماری توہین ہے، یا خود شرافت اور رذالت کا فرق محسوس نہیں کرتے اور یہ انکی اپنی توہین ہے۔